© rasailojaraid.com

فکاہاتِ جلیس - ایک مطالعہ

بہت دن ہوتے ہیں کہ جب یہ نکتہ ایک مردِ دانا نے ہمیں سمجھایا تھا کہ کالم جس صنفِ سخن کا نام ہے، تمہید باندھ کر لکھنے سے اُس کی جنس تبدیل ہوجاتی ہے۔ حتٰی کہ نوع تک کے بدل جانے کا احتمال پیدا ہوجاتا ہے۔ آج کی اخباری اور جریدی دنیا میں کالم کے نام سے جو کچھ چھپ رہا ہے، اُسے دیکھ کر اِس نکتے پر ہمارا یقین مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ مثالوں سے چیزیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن مثالیں ''سلبی'' اور ''ایجابی'' دونوں ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ کالم نگاری کی ایک اچھی مثال حال ہی میں ہمارے مطالعے میں آئی ہے اور وہ ہیں مرحوم ابراہیم جلیس کے کالم۔ اگر کالم کو ادب اور صحافت کا نقطۂ اتصال مان لیا جائے تو جلیس کے یہ کالم اپنی معنوی قدر و قیمت اور ادبی حیثیت ثابت کرنے میں بہمہ وجوہ کامیاب ہیں۔ اِن کالموں کا اسلوب شگفتہ، مزاحیہ اور فکاہیہ ہے جب کہ اِن کی زبان عوامی ہے، آسان ہے اور بے تکلف ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ جو آج کی اردو صحافت میں بہت رونق اور بہت چہل پہل بلکہ صحیح تر لفظوں میں بہت زیادہ رنگ و روغن دیکھا جارہا ہے، اُس کے مہیا کرنے میں کتنے ہی ادوار وعہود اور کتنی ہی مساعی وجھود کا پس منظری کردار رہا ہے۔ زبان، ادب، سماج اور سیاست کی راہوں سے امکانات اور تغیرات کے کتنے ہی قافلے چلے جنھوں نے صحافت کے کوچے کو آباد کیا۔ کبھی یہ ایک مشن تھی، آج ایک صنعت ہے۔ کبھی یہ بہت سادہ تھی، آج بہت رنگین ہے۔ رنگین ہی نہیں، پُرکار بھی ہے۔ پاکستان بنا تو لاہور ایک بنا بنایا صحافتی مرکز تھا۔ پھر کراچی نے آنکھیں کھولیں۔ اس ''عروس البحر'' کے خبری ونشری پر پرزے دنوں ہی میں نکل آئے۔ رنگ جم گیا، سماں بندھ گیا، میدان سج گیا اور پھکیت میدان میں اُتر گئے۔ تاریخ نے ورق پلٹ دیا۔ اور پھر وہ سب لوگ نجانے کہاں کہاں سے آتے چلے گئے جنھوں نے ایک نئے عہد کی راہ میں بچھی آنکھوں، صحافت کی آنکھوں میں امید اور امنگ، شوخی اور شرارت، زندگی اور حرارت بھردی۔ انھی بہت سے لوگوں میں ایک نام جلیس کا بھی ہے۔

ابراہیم جلیس کے فکاہیہ کالموں کے مجموعے فکاہاتِ جلیس میں اِسی زندگی اور اسی حرارت کے عکس ہیں جو جابجا اُبھرتے ہیں، سائے ہیں جو جھومتے اور لہراتے ہیں، اور رنگ ہیں جو بکھرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جلیس کی زندگی اور ملک کی تاریخ کے پچیس سال، ہنگامہ خیز اور بحرانی - یوں کہیے ''فوجداری'' اور ''دیوانی'' - اِن کالموں میں محفوظ ہیں۔ کچھ لوگ چیزوں کو محفوظ کرنے کے لیے حنوط کردیتے ہیں لیکن جلیس کے ہاں ایک اور ہی فن بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اظہار کا بے ساختہ پن، جو تحریروں کو مرنے نہیں دیتا۔ ایک اقتباس دیکھیے کہ......

> ہمارے زمانے میں ایسی فلمیں بہت بنتی تھیں جس میں ہیرو ایک نقاب پوش نوجوان ہوا کرتا تھا جو نیک دل بادشاہ کی خوبصورت شہزادی کو بار بار باغی اور بدطینت دیو یا جن کے چنگل سے بچایا کرتا تھا، اور ایسے موقع پر شہزادی یا بادشاہ پوچھا کرتے ''اے بہادر محسن! اپنا نقاب ہٹا کر بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' تو ہیرو کہتا تھا ''وقت آنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر سب کچھ بتا دیا جائے گا'' یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے پھلانگ، گھوڑے پر سوار، شوں سے غائب۔ مگر سینما ہال میں پبلک چیخ چیخ کر بتاتی تھی ''شہزادی! ہم نے پہچان لیا کہ وہ دلیپ کمار تھا مگر تو نہیں پہچان سکی۔ دُر فٹے منہ تیرا'' وقت کے بارے میں پرانی فلموں کا یہ تھیم ڈائیلاگ ہمیں آج کل بار بار اِس لیے یاد آ رہا ہے کہ اِن دنوں نئے شیرِ پنجاب جناب ......، جب بھی جلسۂ عام نما پریس کانفرنس کرتے ہیں تو اُن کا تھیم ڈائیلاگ بھی ہوتا ہے ''وقت آنے پر میں بھی موجودہ حکومت کے سارے راز فاش کر دوں گا۔ (ص ۱۸۷)

جلیس کے اِن کالموں کے لکھے جانے کا عرصہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کا ہے۔ دسیوں روزناموں اور ہفت روزوں کی کوچہ گردی پر مشتمل اِس کٹھن صحافتی زندگی کا حاصل یہ کالم ہیں جنھیں جواں سال اور جواں ہمت محقق ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے اخباری اور جریدی فائلوں کے قبرستانوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر یکجا کیا، مرتب کیا اور پھر اِن میں ''کتابی روح'' پھونک دی۔ فراموش گاری کی گرد صاف ہوتے ہی بے شمار تخلیقی جملے، تمثیلیں، طنز پارے، اور مزاح نامے اپنی اصل جون میں واپس آ گئے۔

جلیس بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ اُن کا یہی پس منظر اور تربیت و ریاضت اُنھیں گرد و پیش کے مناظر و مظاہر اور حالات و واقعات کو تمثیلی اور علامتی پیرائے میں پیش کرنے کی ایک خاص مہارت فراہم کرتی ہے۔ اِس مہارت کے ثبوت کے طور پر شاید اُن کا ہر دوسرا کالم پیش کیا جا سکتا ہے۔ اِس سلسلے کی غیر معمولی مثال وہ نو (۹) کالم ہیں جو اُنھوں نے یکے بعد دیگرے۔ یعنی تابڑ توڑ۔ ۱۹۷۶ء کے اوائل میں لکھے۔ اُس وقت کی سیاسی صورتِ حال کو Allegorize کرنے کے لیے جلیس نے جنگلی اور حیوانی ''امیجری'' کا اِن کالموں میں خوب خوب استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں......

صبح نو بجے سے چھانگا کے جنگل میں جانوروں کے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی جلسہ گاہ کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ جانوروں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں سے مندوبین اس کونسل میں نہ پہنچے ہوں۔ جلسہ گاہ کے ڈائس پر مشہور مصور پکاسو کے پالتو بندر موسیو سیپانزی کا بنایا ہوا انسان کا ایک ایسا سکیچ تھا کہ اُس سے سانپ بچھو چمٹے تھے۔ گھوڑے گدھے اُس پر دولتیاں چلا رہے تھے اور شیر ببر، چیتے اور تیندوے ہر چہار سمت سے اُس پر جست لگا رہے تھے۔ اور چیل، کوّے اور گدھ اُس کے سر پر باری باری ٹھونگیں لگا رہے تھے۔ اور تو اور کتا جو انسان کا وفادار ازلی غلام تھا، وہ بھی ایک دم فرنٹ، اُس پر بھونک رہا تھا۔

مزے کی بات تو یہ تھی کہ جلسہ گاہ میں مہمانوں اور مبصرین کے لیے ایک الگ انکلوژر بھی تھا جس میں آدم کی ناخلف اولاد یعنی اسمگلر، چور بازار تاجر، ناجائز منافع خور دکان دار، ہر دوسرے تیسرے مہینے کرایہ بڑھانے والے اور بار بار اڈوانس پگڑی طلب کرنے والے لالچی بے مروت مالکانِ مکان، مسافروں کو کم سے کم آرام اور اُن سے زیادہ سے زیادہ کرایہ بٹورنے والے مالکانِ بس و منی بس اور ٹیکسی و رکشہ ڈرائیور، رشوت خور ملازمینِ سرکار، دودھ میں پانی ملانے والے گوالے، گوشت میں چھیچھڑے ملانے والے قصائی، گھی میں موبل آئل ملانے والے گھی فروش، آٹا چینی چاول میں برادہ ملانے والے راشن مرچنٹ، ماں بہن بیوی اور بیٹی کی آبرو بیچنے والے بے غیرت دلّال، قوم و ملک بیچنے والے عوام دشمن، سامراج کے پٹھو ڈکٹیٹر ڈٹے بیٹھے تھے۔

اِن میں صاف طور پر پہچانے جانے والوں میں کمبوڈیا کے مارشل لون نول، جنوبی ویت نام کے جنرل تھیو اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مارشل کاؤ، جنوبی افریقہ کی گوری اقلیت کے انسان دشمن وزیرِاعظم اسمتھ اور اسرائیل کے انسان نما درندے وزیرِاعظم مسٹر رابن نمایاں تھے۔ (ص۲۲۳)

سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ یہ تھا کہ شیر اور بکری ایک ساتھ، ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ اِس عجیب وغریب منظر کو دیکھ کر ایک اخبارنویس نے بڑی حیرت سے دوسرے سے کہا ''پُر امن بقائے باہمی کا اِس سے بہتر ثبوت اور کیا مل سکتا ہے کہ ایک بکری ایک شیر کے ساتھ یوں بے خوف وخطر بڑے اطمینان سے شانہ بشانہ بیٹھی ہے۔'' تو دوسرے اخبارنویس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا ''ارے یہ کوئی نیا نظارہ نہیں ہے۔ ایسا تو میں نے نیو کراچی کے زوالوجیکل گارڈن بلکہ اہلِ کراچی کی عام سیرگاہ ''گاندھی گارڈن'' میں بھی دیکھا ہے۔ وہاں بھی ایک شیر کے پنجرے میں ایک بکری مدتوں سے رہتی ہے اور ابھی زندہ سلامت ہے۔'' اخبارنویس کی یہ گفتگو سن کر شیر کے ساتھ بیٹھی ہوئی بکری کو بڑا غصہ آیا اور اُس نے دونوں فوٹوگرافروں کو ڈانٹا ''اے بے خبر اخبار والو! میں تمھیں گاندھی گارڈن میں شیر اور بکری کے نام نہاد پُرامن بقائے باہمی کا راز بتاتی ہوں کیونکہ میرے خاندان کی کئی بکریاں اس نام نہاد پُرامن بقائے باہمی کی جھوٹی نمائش کے لیے اِس شیر کے پنجرے میں موت کے گھاٹ اتر چکی ہیں۔ تمھاری یہ اطلاع غلط ہے کہ اُس شیر کے پنجرے میں ایک بکری مدتوں سے رہتی ہے اور ابھی تک زندہ سلامت ہے۔ راز کی بات تو یہ ہے کہ دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اُس پنجرے میں روزعلی الصبح ایک نئی بکری باندھی جاتی ہے۔ (ص۲۲۶)

فکاہاتِ جلیس میں ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے کوئی دوسو (۲۰۰) کے لگ بھگ کالم یکجا کیے ہیں۔ اِسے ہم جلیس کے کالموں کا ایک نمائندہ انتخاب قرار دے سکتے ہیں۔ پیروڈیاں، لطیفے، تضمینیں، پنجابی لوک گیتوں کے چست و برجستہ مصرعے، بعض نادر روزمرے اور محاورے۔کتنی ہی سوغاتیں ہیں، جنھیں اِس انتخاب نے آج کے قاری کی حدِ رسائی میں لا کھڑا کیا ہے۔ اِس موقع پر فاضل مرتب و مدون کے انتخاب وترتیب کے ذوق اور محنت کی داد نہ دینا نااِنصافی ہے۔ خصوصًا اُس طول طویل مقدمے کے لیے بھی جنابِ مرتب لائقِ داد ہیں کہ جسے اِس کتاب کی کلید کہنا چاہیے۔ یہ جلیس کی شخصیت، فن اور زندگی کا ایک طویل مختصر جائزہ ہے۔ جلیس کے بعض نقادوں کا احساس ہے کہ اُن کی کالم نگاری کے آخری دور (۱۹۷۷ء-۱۹۶۷ء) میں، اُن کے اسلوب میں کچھ ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جنھوں نے اُن کے فن کو نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے اپنے مقدمے میں نقادوں کی اِس رائے سے اختلاف ضرور کیا ہے لیکن کسی بھی تفصیل یا تجزیے سے گریز کرتے ہوئے۔ ہمارے خیال میں جلیس کے اسلوب کے بارے میں اِس رائے میں خاصا وزن ہے۔ کتاب کے مندرجات اِس کی تائید کرتے ہیں۔ اپنی کالم نگاری کے آخری دور میں جلیس ایک ''کامریڈ'' نظر آتے ہیں، جس کے گردوپیش کی دنیا میں صرف دو طرح کے انسان بستے ہیں: بورژوا اور پرولتاری۔ بورژوا کے لیے اُن کا طنز براہِ راست اور تلخ ہوجاتا ہے۔ اِس میں تمسخر، تضحیک اور اِستہزا کے رنگ بھی جھلکنے لگتے ہیں۔ اُن کے اندر کا ''صحافی'' حقائق ومظاہر کے کسی گہرے تجزیے کا متحمل ہی نہیں ہے بلکہ وہ ''تازہ'' خبروں پر تبصرے سے کالم بناتا چلا جاتا ہے۔ اِس ''تبصرے'' میں فوری ردِعمل، جذباتی ابال، غم وغصہ، بے بسی کا احساس۔سبھی کچھ شامل ہے۔ ایسے میں مزاح کی شگفتگی ناپید اور طنز کی بے ساختگی مجروح ہوتی ہے، اور باربار ہوتی ہے۔ البتہ یہ صورتِ حال بعض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلچسپ داخلی تضادات کے نمایاں ہونے کا سبب بھی بنتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ''رجعت پسندوں'' کے بارے میں اپنے رویّے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> وہ مجھے یا میرے رسالے کو برا سمجھا کریں، میں اُن کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ لوگ بااَخلاق ہوتے ہیں۔ اِن کی سب سے اچھی خصوصیت یہ ہے کہ اِنھیں خریدا نہیں جا سکتا۔ مگر سیاست میں وہ نہ صرف رجعت پسند ہیں بلکہ اِن کا رول آمرانہ یا ہٹلرانہ ہے۔ اِن سے میرا بس اِتنا ہی اختلاف ہے کہ وہ جمہوریت کی بجائے آمریّت کے پرستار ہیں۔(ص۳۶۱)

> اِس موقع پر جلیس اپنے ایک قاری کا یہ اعتراض بھی نقل کرتے ہیں کہ ''ترقی پسند دوست آپ سے ناراض ہیں کہ آپ ایک آمرانہ حکومت کی حمایت کرتے ہیں اور بِک چکے ہیں'' اور جواباً لکھتے ہیں..... ''آپ نے جن ترقی پسند ساتھیوں کا نام لکھا ہے اُن کا کام صرف دوسروں پر اعتراض کرنا ہے۔ میں تو چلیے عوام کے ووٹوں سے منتخب پاکستان کی پہلی عوامی حکومت کے ہاتھوں بکا ہوا ہوں، یہ لوگ تو چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں، بنیوں، بقالوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ اِن پر لعنت بھیجیے۔(ص۳۶۲)

یہی وہ دوٹوک پنا (bluntness) ہے، جس سے اُن کے ضمیر، اُن کے شفاف تخلیقی باطن، اُن کی سچی فن کارانہ کمٹ منٹ کا سراغ ملتا ہے۔ بقول یگانہ ''چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا''! اگر انگریزی محاورے کا سہارا لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ dictates of conscience پر dictates of comrade کے غالب آجانے سے جلیس کے ہاں تخلیقی سطح پر وہ سب مسائل پیدا ہوئے جن کا اِدراک تو شاید اُنھیں خود بھی تھا، مگر تدارک یقیناً اُن کے بس میں نہیں تھا۔

© rasailojaraid.com